بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

النبأ العظیم

(۱۰)

اب مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی تنظیم کا معاملہ لیجئے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ آزادی کے بعد سے سالہا سال تک غالباً کسی مسلمان کو اس کا تصور بھی نہیں آیا۔ اگر کسی کو اس کا خیال آتا بھی ہوگا تو وہ کبھی پلیٹ فارم یا منظر عام پر نہیں آیا۔ لیکن اب ادھر گذشتہ چند برسوں سے یہ آواز پھر اٹھنے لگی ہے اور اگر ہمارا اندازہ غلط نہیں ہے تو اس میں روز بروز شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ جو لوگ اس کے قائل اور داعی ہیں وہ کہتے ہیں کہ تقریباً (۲۳) برس سے ایک سے ایک بڑھ کر فسادات مسلسل ہو رہے ہیں مسلمانوں کے جانی اور مالی نقصانات بے حساب و بے اندازہ ہو رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود حکومت کی سرد مہری بے عملی اور کمزوری کا یہ عالم ہے کہ ہزار تقریروں اور وعدوں کے باوجود نہ مجرموں کو سزا ہوتی ہے اور نہ مسلمانوں کے نقصان کی تلافی کی جاتی ہے۔ ریلیف کا جو کام ہے وہ بھی مسلمانوں کو خود کرنا پڑتا ہے۔ دفعہ ۱۵۳ ایجاد ہوئی تھی فرقہ پرستی اور فساد انگیزی کے سرچشموں کو پاٹنے اور بند کرنے کے لئے لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس کا نشانہ بھی زیادہ تر مسلمان ہی بنتے ہیں۔ گویا:

گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

ایک طرف حکومت کا رویہ یہ ہے اور دوسری جانب من حیث المجموع اکثریت کی روش یہ ہے کہ جس زور شور اور طاقت و قوت کے ساتھ اسے ان فسادات اور ان کے پیدا کردہ نتائج کے خلاف احتجاج

کرنا چاہیئے۔ وہ نہیں کرتی۔ ریلیف کے کاموں میں مسلمانوں کے ساتھ اشتراک وتعاون نہیں کرتی۔ مشرقی پاکستان سے بالکل غیر قانونی طور پر ہندوؤں کے قافلے آنے لگتے ہیں تو ان کو پناہ گزین کہا جاتا ہے اور ان کی آباد کاری کے مطالبہ پر زمین و آسمان ایک کر دیئے جاتے ہیں۔ اور اگر اسی پریشان حالی میں ہزار پانسو کی تعداد میں مسلمان بھی اُدھر سے اِدھر آنکلتے ہیں تو ان کو پناہ گزین نہیں بلکہ دخل انداز (Infiltrators) کے لقب سے یاد کیا جاتا اور مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ غرض کہ یہ حالات ہیں جن کی وجہ سے ایک مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ میں اس ملک میں تنہا ہوں۔ میرے غم اور دکھ درد میں کوئی میرا ساتھی اور شریک نہیں ہے۔ میرے جراحتِ دل کی تواضع کے لئے نمکدانِ ملامت ہزاروں ہیں لیکن مرہم کا پھایہ کسی ایک کے پاس بھی نہیں ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو مجھے خود اپنے کاروانِ حیات کی فکر کرنی چاہیئے اور جداگانہ تنظیم کرکے اپنے وجود کی قدر و قیمت اور اس کی اہمیت دوسروں پر ثابت کرنی چاہیئے:

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا جان تو گیا

یہ مسلمان آنکھ اٹھاکر دیکھتے ہیں تو انھیں ایک طرف کیرالا میں مسلم لیگ نظر آتی ہے اور دوسری جانب شمال میں اکالی دل۔ یہ دونوں جماعتیں اقلیتی فرقوں کی فرقہ وارانہ سیاسی تنظیمیں ہیں اور انھوں نے اپنی ساکھ ایسی قائم کر لی ہے کہ ان کے علاقہ کی ہر سیاسی پارٹی ان کی چشم کرم اور لطفِ نظر کی امیدوار رہتی ہے۔ ان کو دیکھکر دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کے دل میں بھی ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ اب تک جو تدبیریں کی گئیں وہ ناکام رہیں تو اب اس ایک نسخہ کو بھی آزمالینا چاہیئے۔

مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی تنظیم کے جواز میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ ہم نے سطور بالا میں خود کہہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ کہا جائے گا وہ انھیں چند نقطوں کی تشریح و توضیح ہوگی جنھیں اوپر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اگر ذرا سنجیدگی سے غور

کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ رجحان صحت مندانہ اور دور رس نتائج وعواقب کے لحاظ سے کسی طرح بھی مسلمانوں کے لئے مفید، نفع بخش اور قابل اطمینان نہیں۔ بلکہ مضر اور شدید قسم کے خطرات سے پُر ہے۔ اس قسم کے افکار وخیالات اس شخص کے افکار وخیالات جیسے ہیں جو "تنگ آمد بجنگ آمد" پر عمل کرتا ہے اور اس کے فیصلہ میں گھبراہٹ، جلد بازی اور بے صبری ہوتی ہے۔ یہ فیصلہ ٹھنڈے دل سے غور وفکر اور حقیقت پسندی پر نہیں۔ بلکہ فراریت، بیزاری اور کم حوصلگی پر مبنی ہوتا ہے جس کا انجام بعض اوقات خودکشی بھی ہوسکتا ہے۔ خودکشی جس طرح شخصی اور انفرادی ہوتی ہے۔ اسی طرح قومی اور اجتماعی بھی ہوتی ہے۔ ایک انسان شدید غضب واشتعال اور احساسِ بیکسی کے عالم میں جو اقدام کرتا ہے وہ اسے اپنے لئے سرمایۂ تسکین اور ذریعۂ نجات سمجھتا ہے اور فوری طور پر وہ اس سے حظ نفس بھی حاصل کرتا ہے۔ لیکن اگر اس کو فرصتِ عمر میسر آئے تو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب کہ اسے اپنی گذشتہ نادانیوں اور غلطیوں پر ندامت محسوس ہوتی ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب، زبانوں اور رنگ ونسل کے لوگ شانہ بشانہ رہتے ہوں۔ ان سب کا مفاد وطنی اور ملکی معاملات میں باہم دگر اشتراک وتعاون پر موقوف ہو اور وہ سب ایک جمہوری نظام حکومت سے وابستہ ہوں۔ وہاں فرقہ پرستی کسی کو بھی راس نہیں آسکتی۔ نہ اقلیت کو اور نہ اکثریت کو۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اکثریتی طبقہ کی فرقہ پرستی ذرا دیر میں رنگ لاتی ہے اور اقلیتی گروہ کی فرقہ پرستی کے نتائج جلد ظہور پذیر ہونے لگتے ہیں۔ لیکن خمیازہ دونوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے اگر کسی کارخانہ کے مزدوروں میں مل جل کر کام کرنے کی اسپرٹ باقی نہ رہے اور وہ مختلف ٹولیوں میں بٹ کر آپس میں ہی لڑنا جھگڑنا شروع کردیں تو اس سے فائدہ کس کا ہوگا؟ کارخانہ چوپٹ ہوجائے گا اور اس سے جو نقصان ہوگا بقدر حصۂ رسدی ہر ایک کو اس میں شریک ہونا پڑے گا۔ ملک ایک کشتی ہے اگر یہ پار ہوتی ہے تو سب پار ہوتے ہیں اور اگر

ڈوبتی ہے تو ڈوبتے بھی سب ہی ہیں۔ اس شخص کی بدنصیبی کو کیا کہیے جو کشتی میں چھید کر کے یہ سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھی مسافر غرق ہو جائیں گے اور وہ بچ جائے گا۔

اب آئیے اس پر بھی غور کریں کہ مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی تنظیم کا مقصد کیا ہے؟ اور کیا اس سے مسلمانوں کے اس درد و کرب کا علاج ہو سکتا ہے جس میں وہ آج مبتلا ہیں! اس تنظیم کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ چند مخصوص علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس تنظیم کے ماتحت چند مسلمان منتخب ہو جائیں۔ لیکن پورے ملک میں اول تو ایسے علاقے ہیں کتنے؟ اس بنا پر اس نوع کی جو تنظیم بھی ہو گی وہ آل انڈیا نہیں ہو سکتی۔ محض مقامی اور علاقائی ہو گی۔ اور جب مقامی ہو گی تو مسلمانوں کے جو معاملات و مسائل ہمہ گیر ہیں ان کا حل کیونکر ہو گا! پھر علاقائی تنظیم کے ماتحت جو مسلمان منتخب ہو کر لیجسلیچر یا کارپوریشن میں پہونچیں گے۔ پورے ہاؤس میں خود ان کی تعداد کا تناسب کیا ہو گا؟ لامحالہ ان کو کسی نہ کسی ایک پارٹی سے تعاون کرنا ہو گا۔ اس صورت میں تعاون کے بعد بھی یہ پارٹی اقلیت میں رہتی ہے۔ اور اس بنا پر وہ اس پوزیشن میں ہرگز نہیں ہو گی کہ ہاؤس میں اپنی بات یا بالفاظ دیگر مسلمانوں کے مطالبات منوا سکے۔ گذشتہ انتخابات کے موقع پر اتر پردیش اور بہار میں جو تلخ تجربہ ہوا اس سے کون واقف نہیں ہے۔ اردو زبان کا واجبی اور طبعی حق! اور وہ بھی اس کو نہیں مل سکا۔

علاوہ ازیں جنوبی ہند میں اور ہندوستان کے باقی دوسرے حصوں اور خصوصاً شمالی ہند میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جنوبی ہند کا ہندو اور مسلمان دونوں بیدار مغز اور روشن دماغ ہیں۔ وہاں کے مسلمانوں کی سوجھ بوجھ اور روشن ضمیری کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ ٹامل ناڈ میں متعدد لڑکوں اور لڑکیوں کے عظیم الشان کالج ہیں جن کو ایک تعلیمی ٹرسٹ کے ماتحت مسلمانوں نے صرف اپنے روپیہ سے قائم کیا ہے لیکن اس سے استفادہ ہندو اور مسلمان دونوں کر رہے ہیں۔

بلکہ تناسب آبادی کے مطابق غیر مسلم طلباء اور طالبات کی تعداد ان کالجوں میں بھی زیادہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم جن کو جنوبی ہند کا سرسید کہا جاتا ہے وہ جس طرح مسلمانوں میں مقبول تھے اسی طرح ہندو بھی ان کے ساتھ عقیدت و ارادت رکھتے تھے۔ غرض کہ یہاں کبھی فرقہ وارانہ سوال نہیں اٹھا۔ اور دونوں فرقوں کے باہمی تعلقات بڑے خوشگوار رہے ہیں۔ پھر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ جنوبی ہند کے ہندوؤں کو تقسیم سے اول تقسیم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حالات وظروف سے کوئی سابقہ نہیں پڑا۔ اس بنا پر ہندو مسلم تعلقات کی جو نوعیت پہلے تھی وہ تقسیم کے بعد بھی قائم رہی۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کی مسلم لیگ نام کی مسلم لیگ ہے۔ ورنہ اس کا طریق عمل اور اس کی سیاست اس کے نام سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ وہاں ایک ایسی ہی سیاسی پارٹی ہے جیسی کہ دوسری پارٹیاں ہیں۔ اب اس کے بالمقابل اپنے یہاں کے حالات کا جائزہ لیجئے تو وہ بالکل مختلف نظر آئیں گے۔ یہاں ہندی اور پراکرت تہذیب کے جنون نے ہندو کی عقل کو ماؤف کر رکھا ہے اور مسلمان افلاسِ ذہنی وفکری کا شکار ہے۔ یہ صرف گفتار کا غازی ہے۔ تعمیری کاموں سے اسے نہ دلچسپی ہے اور نہ ذوق۔ دونوں فرقوں کے باہمی پہلے تعلقات پہلے بھی اچھے نہیں تھے۔ اب بھی اچھے نہیں ہیں اس بنا پر یہاں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی تنظیم کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ منافرت اور بڑھے اور فسادات پھوٹ پڑیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو اس کی ذمہ داری کس پر ہو گی! بہرحال اس جداگانہ تنظیم کا بہی کھاتہ تیار کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس "سودے" میں اگر نفع کچھ ہے بھی تو بہت تھوڑا اور برائے نام اور اس کے بالمقابل نقصان کا کوئی حدوحساب نہیں! پس اگر یہ اصول صحیح ہے کہ دفع مضرت جلب منفعت سے مقدم ہوتا ہے تو مسلمانوں کو اس قسم کی فرقہ وارانہ سیاسی تنظیمات سے الگ رہنا چاہیئے۔

اگر غور کیجئے تو جو لوگ جداگانہ سیاسی تنظیم کے حامی اور قائل ہیں وہ مسلمانوں